قومیت کی تعمیر میں زبان کی اہمیت

ڈاکٹر نجیبہ عارف*

Abstract:
Nationhood is an intricate, complex and multilayered notion. To define the concept of nationhood, one must answer many other relevant questions. Nation is an organic entity having various constituents. These may include historical and cultural traditions, geographical and ecological similarities, racial identity and ideological likeness. In this respect, if we analyze the constituting elements of the concept of nationhood in Pakistan, we have to admit the ambiguity of a number of ideologies and their connotations. Pakistani nation is unique in the sense that it has chosen its identity in the context of a multi-ethnic society consciously and willfully. For the purpose, it has decided to be and remain one despite the racial, linguistic and cultural differences. This goal can be achieved only if a common language is adopted as a national language which can be a means of communication among all groups within a nation. Yet this issue is not so simple and easy to be solved. The role of the mother tongue in relation to the national language is something to be addressed seriously and sincerely. In a geographic territory, having more than one linguistic groups, the concept of a common language is a must to survive as a nation in the global community.

قومیت کا مسئلہ پچھلے کچھ عرصے سے ایک بار پھر فکری مباحث کا موضوع بن رہا ہے اور اس پر نئے سرے سے غور وغوض کی تحریک چل رہی ہے۔[۱] غالباً اس مکرر توجہ کا سبب سرد جنگ کے خاتمے کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال میں قومیت کے تصور کے فکری و عملی پہلوؤں کا برسر کار آنا اور بین الاقوامی تعلقات میں ایک نئی جہت کا اجاگر ہونا شامل ہیں چنانچہ بڑی بڑی دانش گاہوں میں اس مسئلہ پر کتابیں اور مقالات لکھنے کا کام زور وشور سے جاری ہے اور قومیت کے پرانے اور تسلیم شدہ کردار کو ایک نئے تناظر میں پرکھ کر اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ [۲]

پاکستان میں قومیت کا مسئلہ قیام پاکستان سے پہلے ہی شدید اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ کالونیل ہندوستان ایک کثیر القومی سلطنت تھی جس کے شہری اپنے تشخص کے لیے ایک سے زیادہ علامات کو استعمال کرتے تھے۔ یہ علامات مذہب یا عقیدہ، نسل، زبان، جغرافیائی ماحول اور ان سب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی منفرد تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی روایات پر مبنی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علاقہ ایک برصغیر کہلاتا تھا اور کسی خاص قوم یا قومیت سے وابستہ نہیں تھا اور یہ

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد۔

روایت انگریزوں کی آمد سے قبل یعنی اسلامی دورِ حکومت میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس دور میں اگر کوئی شے اس تنوع کو ایک تشخص دیتی ہوئی نظر آتی ہے تو وہ سیاسی وحدت ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں یہ سیاسی وحدت موجود رہی ہے وہاں کے افراد کے لیے ایک اجتماعی تشخص مہیا کرنے کی ذمہ دار رہی ہے۔ بصورت دیگر مختلف آبادیاں ایک دوسرے سے مختلف اور آزاد تشخص کی حامل رہی ہیں اور اپنے اپنے عقیدے اور تہذیبی پس منظر کے مطابق کسی بھی تنازعے سے محفوظ رہ کر نشو ونما پاتی رہیں۔ ایک ریاست دوسری ریاست کے باشندوں کے نظریاتی تشخص میں مزاحم نہیں ہوتی تھی اور اگر تصادم کی کوئی صورت پیدا ہوتی تھی تو اس کی بنیاد سراسر سیاسی ہوتی تھی، نظریاتی نہیں۔

مگر بیسویں صدی کے نصف اول میں معاملات کچھ الجھ گئے تھے۔ آزادی کا تصور برصغیر کے دو بڑے گروہوں کے لیے مختلف تصورات کا حامل تھا۔ ان تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہندو اکثریت نے مشترکہ قومیت کا نعرہ بلند کیا۔ مشترکہ قومیت کا یہ تصور ان کے مفادات کے تحفظ کا ذمہ دار تھا اور آزادی کے بعد انھیں طاقت کا مرکز بننے میں سہولت فراہم کرتا تھا۔ اس کے جواب میں دوسری بڑی اکثریت کے سیاسی وشہری حقوق کا تحفظ اس امر کا متقاضی تھا کہ وہ اپنی علیحدہ شناخت کو تسلیم کروائیں اور اس کی بنیاد پر سیاسی قوت حاصل کریں۔ اس ضمن میں تشخص کی عام فہم اور جذباتی بنیاد مذہب نے فراہم کی، جسے مختلف تمدنی مظاہر کی حامل قومیتوں نے بھی ایک مشترک بنائے آزادی کے طور پر قبول کیا اور ایک علیحدہ ریاست وجود میں آئی۔

پاکستان کا قیام قومیت کے مغربی تصور اور امت کے اسلامی تصور کا امتزاج ہے۔ اسلامی تصور امت قومیت کی بنیاد نظریے یا عقیدے پر استوار کرتا ہے۔[۳] اور مغربی تصور کے مطابق ایک قوم کو اپنی قومیت کی حفاظت کے لیے ایک جغرافیائی ریاست اور سیاسی اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے۔[۴] پاکستان کا قیام ان دونوں جہتوں پر بنیاد رکھتا ہے۔ اقبال نے قوم اور امت کو الگ الگ تناظر میں پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک قوم رجال کی جماعت کا نام ہے جو بہ اعتبار قبیلہ، نسل، رنگ، زبان، اور وطن کے ختلاف کے ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن ملت ان سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی۔ گویا ملت یا امت جاذب ہے اقوام کی، وہ خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی۔[۵] لیکن جب ۱۹۳۰ء میں انھوں نے خطبۂ الٰہ آباد پیش کیا تو گویا ایک ایسی قوم کا تصور پیش کیا جو بظاہر ایک جغرافیائی خطۂ زمین میں محدود اور ایک سیاسی ہیئت حاکمہ کی مالک ہو گی لیکن بباطن ایک بڑی امت مسلمہ کا جزو ہو گی۔ یہ امت کے دینی تصور کو قومیت کے مغربی تصور سے آمیز کر کے ایک نئی صورت حال کو جنم دینے کا اشارا تھا۔

پاکستان ایک ریاست کے طور پر مختلف قومیتوں کا وطن ہے۔یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک وطن عزیز میں قومیت کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے اور پاکستان کی ساٹھ سالہ مختصر تاریخ میں اس مسئلے کی بنیاد پر کئی اہم واقعات رونما ہوئے ہیں۔دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اہل پاکستان کس بنیاد پر ایک قوم کہلاتے ہیں اور اس سے بھی پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قومیت کی تشکیل میں بالعموم کون کون سے عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

قوم یا قومیت کی کئی طرح سے تعریف کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر جیسا کہ واٹسن نے کہا ہے کہ ان میں سے کوئی تعریف بھی جامع و مانع نہیں ہے۔[٦] مارگریٹ کنوون نے اپنی کتاب نیشن ہڈ اینڈ پولیٹیکل تھیوری[٧] میں قومیت کی بنیاد کے لیے پانچ مختلف تصورات پیش کیے ہیں اور ہر ایک کا معروضی جائزہ لیا ہے۔

ان میں سے پہلے تصور کی رو سے قوم اور ریاست ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔یہ تصور دوسری جنگ عظیم کے بعد زیادہ مقبول ہوا جب فاتح ممالک نے ایک ایسی تنظیم قائم کرنے پر اتفاق رائے ظاہر کیا جس کے ذریعے وہ ان ممالک کے درمیان باہمی تعاون کو فروغ دے سکتے تھے اور اس کا نام اقوام کی تنظیم یا جمعیت رکھا۔یوں اقوام متحدہ سے مراد ایسا پلیٹ فارم قرار پایا جس پر ریاستوں کے درمیان اشتراک ممکن ہے۔اسی اصول کی بنیاد پر کسی ملک کا ترانہ اس کا قومی ترانہ کہلاتا ہے۔کسی ریاست کی نمائندگی کرنے والی ٹیم کو قومی ٹیم کہا جاتا ہے،مختلف ریاستوں کے درمیان تعلقات کو بین الاقوامی تعلقات کا نام دیا جاتا ہے اور اسی اصول کی رو سے ریاست کا سربراہ خود کو اس قوم کا نمائندہ سمجھتا ہے۔یہ تصور قومیت کو ایک سیاسی عمل کے طور پر دیکھنے کا نام ہے اور قوم اور ریاست،دوسرے لفظوں میں نیشن اور سٹیٹ کو،مترادف اصطلاحات کے طور پر استعمال کرتا ہے۔قائداعظم نے اپنے ایک خطبہ میں اسی موقف کو یوں بیان کیا ہے:

> ''دنیا کی سب سے بڑی مسلمان ریاست ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آئی۔یہ ہماری تاریخ کا ایک عظیم دن تھا۔اس دن محض ایک حکومت وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ ایک قوم نے جنم لیا تھا۔حکومت اور قوم دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔میں ان لوگوں کی حدود و قیود سے واقف ہوں جن کا ذہن ابھی اس قدر رسا نہیں ہوا کہ وہ یہ حقیقت سمجھ سکیں کہ پندرہ اگست کا دن کیسی حکومت اور کیسی قوم کا جنم دن ہے۔یہ فطری امر ہے کہ کچھ لوگ محض حکومت کے حوالے سے سوچتے ہیں۔لیکن جتنی جلد ہم نئی قوت

(یعنی قوم) کی حقیقت سے مانوس ہو جائیں اتنا ہی ملک کے لیے بہتر ہوگا اور ہماری چشم تصور ہماری ریاست اور ہماری قوم کے لامحدود امکانات کے آفاق سے آشنا ہوتی جائے گی۔ اور تبھی ہم میں سے ہر ایک کے لیے انسانی ترقی، سماجی انصاف، مساوات اور تنظیم کے ان اعلیٰ مقاصد کا حصول ممکن ہوگا جو پاکستان کے قیام کا بنیادی مقصد ہیں اور ہم اپنی ریاست میں ایک مثالی معاشرتی ڈھانچہ تعمیر کر سکیں گے۔''[۸]

یوں قائداعظم نے واضح طور پر نیشن اور اسٹیٹ کو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم قرار دیا ہے۔

دوسرا تصور قوم کو ثقافتی اشتراک کے حامل گروہ کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ اسے ایک رومانوی تصور سمجھا جاتا ہے جو ثقافتی ولسانی ہم آہنگی کی بنیاد پر قومیت کی تعمیر کا خیال پیش کرتا ہے۔ سیاسی بنیاد پر قومیت کی تشکیل، خارج سے عمل کرنے والے عناصر پر مبنی ہے جب کہ ثقافتی ولسانی بنیاد پر تعمیر ہونے والی قومیت داخل سے ابھر کر خارجی صورت حال کی تشکیل کرتی ہے۔ اس تصور کی رو سے افراد کا وہ گروہ جو مشترکہ زبان، لوک ورثے، داستانوی ادب، دیومالا، روایات وحکایات، شاعری اور تاریخ کا حامل ہے، خود بخود ایک اندرونی اشتراک کے بندھن میں بندھ جاتا ہے اور ایک قومیت کی تعمیر کرتا ہے۔ ان سب عوامل میں سے اہم ترین عنصر لسانی اشتراک ہے جس کے بغیر باہمی رابطے کے بیشتر ذرائع مسدود ہو جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کی بیشتر قوم پرستانہ تحریکیں اسی تصور کی پیداوار ہیں اور اس کی ایک شدید ترین اور انتہا پسندانہ صورت جرمن قوم پرستی کی تحریک میں نظر آتی ہے۔ اس تصور کے قائل افراد کے نزدیک یک زبانی یا مشترک زبان قومیت کا لازمی جزو ہے جس کے بغیر قومیت کی تشکیل کا دعویٰ بے معنی ہے۔ چنانچہ فشے کا قول ہے کہ جہاں کہیں زبان علیحدہ ہوتی ہے وہاں ایک علیحدہ قوم وجود میں آجاتی ہے۔[۹]

Wherever a seperate language is found, there a seperate nation exists

مگر کچھ مفکرین اس تصور کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کے جواب میں ایسی کئی مثالیں پیش کرتے ہیں جہاں مختلف زبانیں بولنے والے گروہ ایک قوم بن جاتے ہیں۔ امریکی معاشرہ اس کی بڑی مثال ہے۔ کینیڈا میں بھی ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ اگر زبان نہیں تو تہذیبی تشخص کی اساس کیا ہو؟ ایک خیال کے مطابق یہ اساس عقیدہ، مذہب یا اخلاقی نظام مہیا کر سکتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ عقیدہ ایک مابعد الطبیعیاتی تصور ہے اور اس کا اثبات افراد کے طرزِ عمل کے ذریعے ہوتا ہے۔ افراد کا طرز بود وباش، ان کے عملی وفکری

رویے اوران کا رہن سہن عقیدے کی تجریدی صورت کوٹھوس حالت میں پیش کرنے کا نام ہے۔لیکن یہ بات بھی یقینی ہے کہ افراد کا طرزِ عمل یا ان کے روزمرہ کے معمولات، ان کی طبائع اوران کے فکری وجسمانی خصائص، ان کے جغرافیائی اورطبعی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ عرب وعجم کے مسلمان مشترک عقیدے کے باوصف علیحدہ علیحدہ تہذیبی اقدار کے مالک ہیں اورایک بڑی امت مسلمہ کا جزو ہونے کے باوجود عالمی منظرنامے میں علیحدہ اقوام کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ پھراگر تہذیبی اشتراک سے مرادطرزعمل اورانسانی رویے ہیں تو یہ بھی روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک ہی تہذیبی ورثے کے مالک افرادمختلف تہذیبی شعور کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی قوم کے شاعراورادیب اپنی تہذیب کی جس ترقی یافتہ صورت کا اظہار کرتے ہیں،ضروری نہیں کہ اسی قوم کے نیم خواندہ افراد کے رویے بھی ویسے ہی تہذیبی شعور پرمبنی ہوں۔

اس مسلے کے حل کے لیے بعض مفکرین نے قومیت کی بنیادافراد کے داخلی جذبۂ تشخص پراستوار کی ہے۔ ڈیوڈ ملر کا کہنا ہے کہ قومیں باطنی یقین کی بناپر وجود میں آتی ہیں۔[۱۰] قوم اسی وقت تعمیر ہوتی ہے جب اس کے افراد یقین رکھتے ہیں کہ وہ ایک قوم ہیں خواہ ان میں لسانی،تہذیبی اورفکری اشتراک موجود ہو یا نہیں۔گویا قومیت کا جذبہ ایک شعوری فیصلے کا نتیجہ ہے جونسل درنسل آگے بڑھتا ہے۔جدید دور کا فلسفہ اس امر کا قائل ہے کہ قومیت کی تعمیر کے لیے کسی بھی قسم کا لسانی،تہذیبی،نظریاتی یا وصفی اشتراک لازمی نہیں۔واٹسن کا کہنا ہے کہ ایک قوم اس وقت وجود میں آتی ہے جب افراد کی ایک قابل لحاظ تعداد اس امر کا فیصلہ کرلیتی ہے کہ وہ مل کرایک قوم بنانا چاہتے ہیں۔[۱۱] اسی لیے بینڈکٹ اینڈرسن نے قوم کوایک تخیلی جماعت قرار دیا ہے۔[۱۲] مغرب میں اس جدید تصور کو خاصی پذیرائی حاصل ہورہی ہے کیونکہ یہ افراد کے ایسے گروہ پرمبنی قوم کا تصور دیتی ہے جو براہ راست ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملتے مگر لسانی وسائل اورطباعت شدہ ادبی مواد کے ذریعے ہم آہنگی کا احساس قائم رکھتے ہیں۔ یوں یہ قومیت محض خیال میں قائم رہتی ہے۔اینڈرسن سے بہت پہلے یہ خیال ۱۸۸۲ء میں ارنسٹ رینان نے بھی پیش کیا تھا کہ قومیت کا وجود مسلسل رائے دہی کے عمل کا نام ہے۔[۱۳] تاہم اس تصور کوقومیت کی بنیادتسلیم کرنے میں بھی خاصی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ایک سراسر موضوعی تصور ہے۔اوراس کا نتیجہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر کسی قوم کے تمام افراد میں قومیت کا شعوری احساس ختم ہوجائے تو وہ قوم معدوم ہوجائے۔اگرچہ عام زندگی میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ قومیں مسلسل اندورنی طور پرتبدیلی وتغیر کے عمل سے گزرتی ہیں اوراس طرح نشوونماپاتی ہیں۔بعض اوقات وہ اپنے بنیادی تشکیلی عناصر سے روگردانی بھی کرلیتی ہیں مگر بحیثیت قوم ان کی شناخت معدوم نہیں ہوتی کیونکہ وہ محض دورحاضر کی

نسل کے شعور کی محتاج نہیں ہوتیں بلکہ ایک مشترکہ تاریخی شعور بھی ان کی بنیاد مضبوط کرتا ہے۔ تاریخی وراثت کا یہ احساس اس امر کا متقاضی ہے کہ قومیت کے تصور کو محض افراد کی ترجیحات پر مبنی قرار نہ دیا جائے۔ اصل بات صرف یہ نہیں کہ فرد خود اپنے لیے قومیت کا کیا تصور قائم کرتا ہے بلکہ یہ بات بھی اتنی ہی اہم ہے کہ دوسرے اس کی قومیت کو کس طرح دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور یوں قومیت کا تصور موضوعی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معروضی حقیقت بھی ہے۔ جیسا کہ رینان نے کہا ہے۔

> ''قوم ایک روحانی اصول کا نام ہے۔ اس کے دو اجزا ہیں جو مل کر ایک بن جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق ماضی سے ہے اور دوسرے کا حال سے۔ ایک طرف اجتماعی یادداشت کی عظیم وراثت ہے تو دوسری طرف ایک معروضی اتفاق رائے اور مل کر رہنے کی خواہش تاکہ اس اجتماعی ورثے سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔''[۱۴]

دوسری طرف ایک جدید معاشرے میں جہاں افراد اپنے زوج، اپنے پیشے، مذہب اور طرز عمل کے انتخاب کا حق کسی اور کو دینے پر تیار نہیں، قومیت کا یہ تاریخی جبر مزاحمت پیدا کرنے کا باعث بھی ہو رہا ہے۔ کیا فرد اپنی قومیت خود متعین کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ یا کیا اسے اس امر کا اختیار حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ جس قومیت کو چاہے اختیار کر سکے؟ یہ سوال ترقی یافتہ جدید معاشروں کے شہریوں کے ذہن میں بڑی شدومد سے اٹھ رہا ہے۔ اسی بات کی طرف اشارا کرتے ہوئے چارلس مارازنے بڑی بے چارگی کے عالم میں لکھا تھا:

> ''ہم اپنی مرضی سے فرانسیسی نہیں بنے۔ ہم نے اپنے ارادے سے اپنی قومیت کا تعین نہیں کیا۔ اس تعین میں فیصلہ کن کردار ہماری پیدائش ادا کرتی ہے۔ جس طرح ہم اپنے والدین کا انتخاب خود نہیں کر سکتے اسی طرح اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین بھی خود منتخب نہیں کر سکتے۔''[۱۵]

اس صورت حال کا اطلاق اگر ان افراد پر کیا جائے جو اپنی زندگی میں شعوری طور پر شہریت بدل لیتے ہیں اور دوسری قومیت اختیار کر لیتے ہیں۔ تو ایک نئی صورت جنم لیتی ہے۔ کیا شہریت بدل لینے سے قومیت بدلی جا سکتی ہے؟ کیا سرکاری اندراج میں قومیت کی تبدیلی فرد کو اس کے تاریخی ورثے کے اثرات سے پاک کر دیتی ہے؟ اور اگر یہ سچ ہے تو کیا سبب ہے کہ گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد تیس تیس سال سے امریکی کہلانے والے مسلمان یکا یک اپنے

اپنے شہر ماضی کی طرف پلٹنے پر مجبور ہو گئے۔

اگر پیدائش کا وقوعہ ہی قومیت کی بنیاد ہے تو کیا قوم کو ایک بڑے ایتھنک [۱۶] گروہ کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ تاریخ نسل کی بنیاد پر قومیت کی کئی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ مشرق میں یہود و ہنود اور منگولوں کا چرچا ہے تو مغرب کی تاریخ بھی اینگلز، سیکسن اور جیوٹ کے ذکر سے خالی نہیں حتیٰ کہ جدید ریاستیں بھی ایسے بڑے اجتماعی گروہوں سے دوچار ہیں، مثلاً جرمنی میں ترکوں کی علیحدہ شناخت، اسی طرح آسٹریلیا میں ایب اوریجنیز۔ جنھیں اپنے اپنے معاشرے میں علیحدہ ایتھنک گروہوں کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ گروہ بندی اس خیال پر بنیاد رکھتی ہے کہ عالم انسانیت فطری طور پر قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم ہے جو اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق اپنا اپنا تمدن اور تہذیب و ثقافت تعمیر کرتے ہیں اور بالآخر اپنے لیے ایک علیحدہ اور خود مختار ریاست قائم کرنے کے حق دار ہیں۔ تاہم یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایسے نسلی گروہ کیا واقعی کسی فطری تقسیم کا اظہار ہیں یا یہ بھی تاریخ کے طویل المدت عمل کے نتیجے کے طور پر ابھرے ہیں۔ نسل کی بنیاد پر قومیت افراد کے احساس آزادی کو تو محدود کر دیتی ہے مگر قومیت کے تصور کو ایک ایسا تقدس بھی عطا کرتی ہے جس کے نتیجے میں فرد اپنی قوم کو اپنی ذات سے بالاتر حقیقت تصور کرتے ہوئے اس کے لیے ذاتی مفادات کی قربانی دینے کو تیار رہتا ہے کیونکہ یہ اس کے ذاتی تشخص کی بنیاد ہے۔ اس گہری وابستگی کے منفی نتائج جرمن قوم کی نسل پرستی کے اظہار میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ جدید دور میں نسلی امتیاز کی بنا پر قومیت کی تشکیل کو اس لیے بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا کیونکہ کئی بڑی معاصر قومیں اور معاشرے مختلف نسلی اوصاف کے حامل گروہوں پر مبنی ہیں جو سیاسی مفادات کے تحت ایک مشترکہ قومیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ امریکہ اور سوئٹزرلینڈ اس کی مثالیں ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ نسلی تشخص کوئی ایسا ٹھوس شناختی نشان ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک سیال علامت ہے کیونکہ صدیوں سے مختلف نسلوں کے درمیان ربط و اشتراک کی روایت قائم ہے اور جدید معاشروں میں تو مختلف نسلوں کے درمیان یہ تعلق بہت تیزی سے عام ہو رہا ہے لہٰذا اسے قومیت کی مستقل بنیاد تسلیم کرنا مشکل ہے۔

جدیدیت نے اسی لیے قومیت کے جذبے کی تعریف کرتے ہوئے اسے قوم کی تخلیق کا عمل قرار دیا ہے۔ [۱۷] قومیت کا تشکیل کا عمل ایک متحرک عمل ہے، ساکت و جامد نہیں۔ قومیں بنی بنائی اور ڈھلی ڈھلائی نہیں ملتیں۔ یہ مسلسل تخریب و تعمیر کی آویزش سے دوچار رہتی ہیں اور ہر لمحہ بنتی اور بگڑتی ہیں۔ جدیدیت کے فلسفہ کے مطابق قومیت کا مقصد پہلے سے موجود مختلف جماعتوں اور گروہوں کے درمیان خود شعوری اجاگر کرنا نہیں ہے بلکہ زمانۂ حال کے تقاضوں کے مطابق ایسے نئے گروہ اور جماعتیں تشکیل دینا ہے جو خود کو ایک قوم کے طور پر استوار کر سکیں اور

ہرلحظہ بدلتی ہوئی خارجی صورت حال کی ضرورتوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہوسکیں۔

قومیت کی تعریف، تشکیل اور اس کے مقاصد کے متعلق ان تمام نظریات میں جزوی صداقت موجود ہے۔ قومیت کی تشکیل ایک سیاسی قوت یا اقتدار کی تابع بھی ہے، اور تہذیبی وثقافتی اقدار کے اشتراک پر بھی بنیاد رکھتی ہے۔ ان اقدار میں مشترک تاریخ، زبان، نظامِ عقائد، طرز بود و باش، ادبی سرمایہ، لوک ورثہ، علمی وفنی میراث اور ایسے ہی کئی مظاہر شامل ہیں۔ داخلی شعور اور ارادہ بھی قومیت کی تعمیر میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے نسلی یا گروہی اشتراک بھی اس کی بنیاد بن سکتا ہے اور جدیدیت کے فلسفے کے مطابق اسے اپنی ضروریات یا وقت کے تقاضوں کے مطابق خود بھی تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں قومیت کی تعمیر وتشکیل کن غالب عناصر پر بنیاد رکھتی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ پاکستانی قوم نے اپنے آپ کو ایک علیحدہ مملکت کا حق دار قرار دینے کے لیے اپنے قومی تشخص کی بنیاد ایک عقیدے یا نظریے پر استوار کی تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس عقیدے یا نظریے کی جتنی تعبیریں کی جاتی ہیں وہ سب درست ہیں یا غلط، مگر یہ بات طے ہے کہ اپنے معاشی اور سماجی حقوق کی پاسبانی کے لیے برصغیر کے ایک بڑے ایتھنک گروہ نے اپنے نظریے کو بنیاد بناتے ہوئے خود کو ایک علیحدہ ریاست کا حق دار ثابت کیا تھا۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تحریک پاکستان سے قبل قومیت کا مسئلہ برصغیر کے باشندوں کے لیے شناخت یا تشخص کے بحران کا باعث نہیں تھا۔ موجودہ پاکستانی علاقوں میں بسنے والی کچھ قومیں اپنے علاقے یا جغرافیائی ماحول سے وابستہ تھیں، جیسے پنجاب کے رہنے والے پنجابی کہلاتے تھے خواہ وہ نسلی ولسانی حوالے سے ایک گروہ ہوں یا نہ ہوں۔ سرائیکی، پوٹھوہاری اور پہاڑی بولیاں ان کی زبان پنجابی کی مزید تقسیم شدہ صورتیں تھیں، اسی طرح سندھ میں آباد افراد، خواہ کسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں سندھی کہلاتے تھے۔ کشمیر کے رہنے والے بھی اپنے خطۂ زمین کے حوالے سے اپنی شناخت رکھتے تھے۔ البتہ موجودہ پاکستان کی شمالی مغربی سرحد پر آباد قبائل اپنے علاقے کی بجائے نسلی تشخص کو ترجیح دیتے تھے اور اسی کی بنیاد پر پہچانے جاتے تھے۔ یہی حال بلوچستان کے باشندوں کا تھا۔ موجودہ ہندوستان کے علاقے بھی یونہی مختلف بنیادوں پر اپنی شناخت کے دعوے دار تھے۔ ان میں لسانی گروہ بھی تھے، نسلی بھی اور جغرافیائی بھی۔ یہ صورت حال مجموعی طور پر کسی کے لیے باعث تشویش نہیں تھی اور ہر علاقے کی منفرد شناخت ہر ایک کے لیے قابل قبول تھی۔ سیاسی اعتبار سے اقتدار کے حصول کے لیے جو بھی کوششیں ہوئیں ان میں سے کوئی بھی کسی قوم کے تشخص کو تبدیل کرنے کی دعوے دار نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کی ضرورت سمجھی گئی۔ انیسویں

صدی کے آغاز میں جب استعماری استحصال بڑھنے لگا، مقامی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا اور ایک بڑی قوت سے حریفانہ کشاکش کا باقاعدہ آغاز ہوا تو یہ تمام منقسم قومیں اپنے پرانے علاقائی، لسانی یا نسلی تشخص کو بھلا کر بڑے گروہوں یا جماعتوں میں شامل ہونے لگیں۔ سامراجی قوت نے جو سازش ہندوستانی قوم کی طاقت کو کم زور کرنے کے لیے ترتیب دی تھی وہ ایک لحاظ سے تو کامیاب رہی لیکن اس کا ایک اور نتیجہ بھی نکلا اور وہ یہ کہ ہندوستانی، اپنے نسلی، لسانی اور علاقائی اختلافات بھلا کر بڑے بڑے گروہوں میں منظّم ہونے لگے جو آخر کار ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل دو بڑے اور موثر گروہوں کی تشکیل کا باعث بنے۔ یہ گروہ سامراجی قوت کے مقابلہ میں تو تہذیبی و جغرافیائی حقائق کی بنا پر مشترک مقاصد کے لیے قائم ہوئے مگر آپس میں ایک دوسرے کے مقابل دین و مذہب یا عقیدے کی بنا پر صف آرا ہوئے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مذہب یا عقیدے کی بنا پر عوام الناس کو سب سے زیادہ آسانی سے متحد کیا جا سکتا ہے کیونکہ مذہب ایک زبردست قوت جاذبہ فراہم کرتا ہے جو تمام لسانی، نسلی اور علاقائی اختلافات پر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ ایک بڑے مقناطیس کی طرح ہے جو چھوٹے چھوٹے تمام مقناطیس اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

بیسویں صدی کے وسط میں جب سامراجی اقتدار کا خاتمہ ہوا تو مذہب کے نام پر متحد ہونے والے دونوں بڑے گروہوں کو ایک ایک خطۂ زمین اور سیاسی اقتدار دونوں حاصل ہوگئے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد رقم ہونے والی تاریخ دونوں قوموں کے لیے علیحدہ اور ایک دوسرے سے مختلف معنویت کی حامل ہوگئی۔ یہاں ایک لمحے کے لیے رک کر اس حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ برصغیر کی تقسیم حقیقت میں کس بنیاد پر ہوئی؟ کیا صرف مذہب کی بنیاد پر؟ لیکن دوسرے ہزاریے میں یہ دونوں قومیں مذہبی اختلاف کے باوجود ایک مشترکہ معاشرے میں موجود رہی ہیں۔ تو پھر کیا تہذیبی اقدار کی بنیاد پر؟ یہ جواب بھی کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ ادبی و فنی میراث بھی دونوں کی مشترک رہی ہے اور رہی لسانی و نسلی ہم آہنگی تو یہ اس خطے میں کبھی بھی موجود نہیں تھی اور نہ موجودہ پاکستان اور ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ تو پھر آخر کیوں ایک ہندوستانی قوم دو قوموں میں تقسیم ہوئی۔ میرے خیال میں اس کا سبب وہی ہے جو جدیدیت کے فلسفے نے پیش کیا ہے۔ مسلمان قیادت نے اس وقت کی صورت حال کے تناظر میں یہ بھانپ لیا تھا کہ جو قومیت ایک متحدہ ہندوستان میں صدیوں سے محفوظ و مامون تھی، وہ اس وقت معاشی و اقتصادی اور تہذیبی و مذہبی اعتبار سے خطرات سے دوچار ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ختم ہو جاتا یا وہ زبردستی اپنی تہذیبی اقدار سے محروم کر دیئے جاتے مگر یہ ضرور ہے کہ غالب اکثریت کے مقابلے میں ان کی معاشی اور معاشرتی دونوں حیثیتیں مغلوب و محکوم ہو جاتیں اور انھیں اپنے دینی اور قومی تشخص کو قائم رکھنے میں دقت پیش آتی

جیسا کہ اب متحدہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان باشندوں کو پیش آ رہی ہے۔ چنانچہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لاالہٰ الاّ اللہ کا نعرہ عوام کی جذباتی قوت کے استعمال کا ایک انتہائی کامیاب نفسیاتی قرینہ ثابت ہوا اور برصغیر کے مسلمانوں نے اس نعرہ کی بلند آہنگی سے پیدا ہونے والے جوش وخروش میں ایک سیاسی ہیئت حاکمہ قائم کر لی۔

اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کے بعد سب سے پہلا سوال اسی قومیت کی تشکیل کا تھا اس لیے کہ جو نعرہ قیام پاکستان کا سبب بنا تھا وہ عملی طور پر اس کے استحکام کی ضمانت اس وقت تک نہیں بن سکتا تھا جب تک یہ طے نہ کر لیا جاتا کہ پاکستان میں موجود مختلف لسانی، نسلی اور تہذیبی گروہوں کی بیک وقت دلداری اور تالیف قلب کا کیا بندوبست ہونا چاہیے۔ امت مسلمہ کا جو عظیم تر اور آفاقی تصور اقبال نے تحریک پاکستان کے دنوں میں پیش کیا تھا اسے ایک اسلامی سلطنت کے استحکام کے لیے کس طرح استعمال کیا جا سکتا تھا یہ ایک عملی دشواری تھی۔ دنیا بھر کے مسلمان جذباتی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ضرور ہو سکتے ہیں لیکن ان کا لسانی وعلاقائی تنوع انھیں ایک علیحدہ تشخص بھی فراہم کرتا ہے۔ اس تشخص کو کس طرح قائم اور اجاگر کیا جائے۔ سب سے پہلے جس مسئلے نے سر ابھارا وہ لسانی اختلاف کا مسئلہ تھا۔ اس وقت پاکستان دو بڑی اکائیوں میں تقسیم تھا اور مسئلہ قومی زبان کے تعین کا تھا۔ قائد اعظم اس مسئلے کی اہمیت شروع سے ہی سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی ابتدائی تقریروں میں ہی یہ واضح کر دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔ اس وقت یہ اختلاف اردو اور بنگالی کے درمیان ابھر کر سامنے آیا تھا۔ قائد اعظم نے ڈھاکہ میں اپنی تقریروں کے دوران صاف صاف واضح کر دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان، جو پورے ملک کے درمیان رابطے کا ذریعہ اور قومی یک جہتی کی بنیاد بن سکتی ہے صرف اور صرف اردو ہی ہو سکتی ہے۔

انھوں نے فرمایا:

> ''پاکستان کی سرکاری زبان کے سلسلہ میں میں اپنے نقطۂ نظر کا پھر اعادہ کرتا ہوں۔ اس صوبے کے دفتری استعمال کے لیے اس صوبے کے عوام جس زبان کو چاہیں منتخب کر سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ اس صوبے کے عوام کی خواہشوں کے مطابق ان کے منتخب نمائندے کسی مناسب وقت آزادانہ طور پر اور مکمل غیر جانب داری سے حل کر سکتے ہیں۔ تاہم لنگوا فرانکا کی حیثیت سے صرف ایک زبان ہی مملکت کے مختلف صوبوں میں باہمی رابطے کا کام دے سکتی ہے اور وہ زبان اردو ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ خبردار اس سلسلہ

میں کوئی غلطی نہ کرنا سرکاری زبان صرف ایک ہوسکتی ہے۔ اگر اس مملکت کے مختلف حصوں کو کوئی زبان متحد رکھ سکتی ہے تو وہ زبان میری رائے میں صرف اردو ہوسکتی ہے۔''[۱۸]

قائداعظم نے اس تقریر میں اردو کو ایک لنگوافرانکا کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی جو ہدایت کی تھی وہ آج بھی اتنی ہی اہم ہے حالانکہ اب یہ مسئلہ پہلے سے کہیں زیادہ الجھ گیا ہے۔ قیام پاکستان کے پہلے پچیس برسوں ہی میں اس کا ایک حصہ جن وجوہات کی بنا پر علیحدہ ہوگیا تھا ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کا بغور اور ہمدردی سے جائزہ لیا جاتا اور ان کے تدارک کی کوئی واضح پالیسی مرتب کی جاتی مگر افسوس کہ ایسا کچھ نہ ہوا اور آج مملکت کے قیام کے ساٹھ سال بعد بھی ہمیں اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قومیت کی تشکیل کن عناصر کی بنیاد پر ہوسکتی ہے اور زبان اس معاملے میں کیا کردار ادا کرسکتی ہے۔

قومیت کی تشکیل میں زبان یقیناً اہم کردار ادا کرتی ہے مگر یہ قومی احساس کی واحد بنیاد نہیں بن سکتی۔ دنیا میں ایسی کئی قومیں موجود ہیں جو مختلف زبانیں بولنے والے گروہوں پر مبنی ہیں مگر سیاسی اور خارجی طور پر ایک قوم سمجھی جاتی ہیں۔ گویا محض مشترک زبان قومیت کی تشکیل کی ذمہ دار نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے کئی دوسرے عناصر بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس امر سے چشم پوشی کرنا بھی ممکن نہیں کہ دیگر تمام تہذیبی و ثقافتی عوامل میں سے جو عنصر کلیدی اہمیت کا حامل ہے وہ ایک مشترک زبان کی موجودگی ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت پاکستانی قوم دیگر عوامل کی طرح زبان کے مسئلے پر بھی انتہا پسندانہ رویے کا شکار ہے۔ ایک طرف اردو بمقابلہ انگریزی کے مباحث جاری ہیں تو دوسری طرف اردو کو پاکستان کی دیگر زبانوں کے مقابل صف آرا کرنے کی سعی ہو رہی ہے۔ کچھ لوگ صرف زبان کو قومی تشخص کی بنیاد سمجھتے ہیں اور کچھ اسے ایک انفرادی اور ذاتی معاملہ قرار دیتے ہیں۔ اس نازک معاملے کو بڑی سوجھ بوجھ سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں زبان قومی تشخص کی واحد بنیاد نہیں ہے۔ قومیت کی تشکیل میں کئی دیگر عوامل بھی بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن زبان ان دیگر عوامل سے اس طور پر زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ ان تمام عوامل کو آپس میں مربوط و منظّم کرتی ہے۔ زبان ربط باہم کی ایک ایسی قوت فراہم کرتی ہے جس کے بغیر دیگر عوامل اپنا کام پوری طرح انجام نہیں دے سکتے۔ اگر کوئی قوم اپنی مختلف علاقائی زبانیں رکھنے کے باوجود ایک مشترک قومی زبان سے محروم ہوگی تو دیگر تمام عوامل اپنا اثر کھو دیں گے۔

لیکن اس مسئلے کا دوسرا پہلو زیادہ نازک ہے۔ زبان محض ذریعۂ اظہار ہی نہیں اور محض ماضی سے رشتہ جوڑنے

کا آلہ ہی نہیں۔ اپنی معروضی صورت حال میں افراد کی معاشی و معاشرتی حیثیت سے بھی مربوط ہے۔ زبان کی یہ عملی افادیت بنیادی طور پر زبان کے بارے میں انسانی رویوں کی تشکیل کا باعث ہے۔ اگر کسی زبان کو سماجی عزت و وقار کا مرتبہ دینا مقصود ہو تو محض اس کی تاریخی و تہذیبی اہمیت کا تذکرہ کافی نہ ہوگا بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے عملی طور پر ایسی سرگرمیوں سے مربوط کیا جائے جو اس کے بولنے والوں کو سماجی طور پر باعزت اور باوقار مقام فراہم کر سکیں۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ذریعۂ تعلیم کے طور پر اس کا استعمال اور تمام دفتری امور میں اس کا استعمال۔ خاص طور پر ان امور میں جو فرد کی معاشی و معاشرتی ترقی کا سبب بنتے ہیں مثلاً ایسے امتحانات جن کے نتیجے میں اعلیٰ ملازمتوں کا حصول ممکن ہو، یا سماجی طور پر بلند مرتبہ سمجھے جانے والے مواقع جو معاشرے کے اکثر افراد کے لیے قابل تقلید ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں ذرائع ابلاغ کے بڑھتے ہوئے کردار کے باعث کسی زبان کو فروغ دینے کا کام کچھ ایسا مشکل نہیں رہا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ معاشرہ کا برسر اقتدار طبقہ اس کے فروغ میں سنجیدہ ہو۔ دنیا کی کئی بڑی بڑی زبانوں کی تاریخ اس امر کی شاہد رہی ہے۔ یہی کچھ ایک ہزار برس ادھر کی بات ہے، انگریزی زبان فرانسیسی کے مقابلے میں ایک مقامی بولی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ انگلستان میں درباری زبان، درس و تدریس کی زبان، علم و ادب کی زبان، عدالتی اور دفتری امور کی زبان اور معاشرتی رتبے کی حامل زبان فرانسیسی ہی تھی۔ مگر تین سو سال کے اندر اندر یہ زبان ایک علیحدہ ذریعۂ اظہار ہی نہیں بنی بلکہ ایک قوم کے قومی افتخار کا نشان بھی بن گئی۔ یہ زبان انگریز قوم کے فرانسیسی تسلط سے آزادی کی پہچان قرار پائی لیکن اس کے باوجود ادب و فن کی فرانسیسی جہتوں اور تحریکوں سے باقاعدہ استفادہ کرتی رہی اور سیراب ہوتی رہی۔ نتیجہ آج سامنے ہے۔ چین جیسا عظیم ملک بھی اپنے سکولوں میں انگریزی کو ایک بین الاقوامی زبان کے طور پر پڑھانے پر مجبور ہے۔ یورپ کے کئی ممالک میں جہاں انگریزی کو نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، انگریزی کی تدریس کی اہمیت بڑھ رہی ہے لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ تمام ممالک انگریزی یا کسی بھی دوسری بین الاقوامی زبان کو اپنی قومی زبان سے بدلنے پر تیار نہیں ہیں بلکہ اسے ایک علیحدہ غیر ملکی زبان کی حیثیت سے سیکھنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں ابھی تک یہ بحث اپنے منطقی نتیجے کو نہیں پہنچی کہ ایک قومی زبان کو تسلیم کیے بغیر اور اسے اس کی جائز حیثیت عطا کیے بغیر قوم کی فکری و ذہنی ترقی رک جاتی ہے۔ پاکستانی قوم محض ایک مجرد تصور کا نام نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت اور ایک معروضی ریاست کی ترجمان ہے۔ اس ریاست کے شہریوں کو نہ صرف ایک دوسرے سے روابط قائم کرنے اور رکھنے کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے بلکہ دوسری اقوام کے مقابلے میں اپنے قومی تشخص کو استوار کرنے کے لیے بھی ایک قومی زبان کو اپنانے کی اشد

ضرورت ہے۔ رہا یہ سوال یہ اردو ہی کیوں جب کہ اردو پاکستان میں موجود خطوں میں سے کسی ایک کی بھی زبان نہیں رہی تو جواب یہ ہے کہ اردو نہیں تو پھر کیا؟ کیا انگریزی اردو کی جگہ لے سکتی ہے؟ اس امکان کے پہلوؤں کا جائزہ لیجیے۔ انگریزی زبان ایک بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے۔ اس حوالے سے اس کی تحصیل لازم ہے لیکن انگریزی اور اردو کے مزاج میں وہی فرق ہے جو ایک انگریز اور ایک پاکستانی کی طبیعت، مزاج اور اٹھان میں۔ انگریزی زبان انگریزی تہذیب و تمدن کی ترجمان ہے اور اردو برصغیر کے باشندوں کے تہذیبی رچاؤ، نفاستِ مزاج اور ذوق و تمدن کی اعلیٰ ترین صورتوں کی عکاس ہے۔ جیسا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے فرمایا تھا:

> ''قومی زبان کی اہمیت و قوت و اثر کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ اس کا ہر لفظ، ہر جملہ، ہر محاورہ اور روزمرہ، اس کی ہر ترکیب، ہماری تہذیب، ہمارے آداب اور ہماری معاشرت کی جڑوں اور ریشوں تک پہنچی ہوئی ہے اور اس کے ایک ایک لفظ کے پیچھے ہماری تاریخ و تہذیب کا ایک بڑا سلسلہ ہے۔''[۱۹]

اردو انگریزی کے مقابلے میں اس خطے کے باشندوں کی نفسیاتی، جذباتی اور فکری ساخت کے قریب ترین ہے اور اس کے بہتر اظہار پر قادر ہے۔ اردو میں دینی ادب کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے اور اس کا شمار دنیا کی چار بڑی اسلامی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پروفیسر فتح محمد ملک کے الفاظ میں، اردو پاکستان کی قومی زبان اس لیے ہے کہ یہ ہماری آزادی کی تحریکوں کی زبان ہے۔، یہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، تحریک خلافت اور تحریکِ پاکستان کی زبان ہے۔[۲۰] پھر یہ بات بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ اردو کا علمی و ادبی سرمایہ اس خطے میں بولی جانے والی دیگر تمام زبانوں سے زیادہ وسیع ہے اور ایک جدید دور کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی گنجائش اردو میں کہیں زیادہ ہے۔ یہاں یہ کہنا مقصود نہیں کہ پاکستان میں بولی جانے والی دیگر زبانوں کا ادبی سرمایہ اردو سے کمتر حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سندھی، پنجابی، کشمیری، بلوچی اور پشتو زبانیں بھی ایک قابلِ فخر ماضی کی مالک ہیں لیکن ذریعۂ تعلیم اور سرکاری زبان کی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کسی ایسی زبان کا انتخاب ضروری ہے جو ملک کے ہر حصے میں یکساں طور پر بولی اور سمجھی جا سکے۔ اردو کا کسی خاص علاقے کی زبان نہ ہونا تو اس کے حق میں دلیل کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس طرح اردو کی وکالت میں جانب داری کا امکان رد ہو جاتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے تصور کیجیے کہ پاکستان کے چاروں صوبوں میں الگ الگ زبانیں ذریعۂ تعلیم قرار پا جائیں تو نتیجہ کیا ہوگا؟ ایک صوبے کے باشندے دوسرے صوبے میں تجارت نہیں کر سکیں گے، تعلیم حاصل نہیں کر سکیں گے، نوکری نہیں کر سکیں

گے اور اور ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کر سکیں گے۔ اسمبلی میں ان کی آواز صرف ان کے اپنے لوگ سن سکیں گے اور ایک ملک کے اندر چھوٹے چھوٹے کئی اور ملک بن جائیں گے۔ شاید آپ کہیں کہ اچھا ہی ہوگا۔ مگر اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے ایک نظر عالمی صورت حال کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

ہمارے اردگرد کا بین الاقوامی منظر نامہ کہ رہا ہے کہ آنے والا وقت ایک دوسرے سے جڑ کر جینے پر مجبور کر دے گا۔ یورپی ممالک جو کل تک دست و گریباں تھے اور آج بھی در پردہ ایک دوسرے کو حریف سمجھتے ہیں، اقتصادی ترقی کی خاطر یورپی یونین بنا کر واحد کرنسی کے اجرا اور ویزے کی پابندی ختم کر دینے کی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں اور نتیجہ یہ کہ یورو کی طاقت عالمی منڈی میں دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور ڈالر اور اہل ڈالر کی پریشانی دیدنی ہے۔

آج جب کہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی ختم ہونے کو ہے، یورپی یونین ایک نئی ابھرتی ہوئی طاقت ہے۔ دوسری طرف ابھی پچھلے دنوں روس نے جارجیا پر چڑھائی کر کے، قصۂ پارینہ بنتی ہوئی سرد جنگ کے امکانات کو ایک بار پھر دیا سلائی دکھا دی ہے۔ دنیا جو پچھلی کئی دہائیوں سے یک قطبی یا یونی پولر سیاست کا تماشا دیکھ رہی تھی اور اس کے اثرات سے خوفزدہ تھی، اب عالم امکان پر ایک نئے خونی منظر نامے کی جھلک دیکھ رہی ہے۔ اس تیزی سے رنگ بدلتی دنیا میں اہل پاکستان کو اپنے لیے ایک فیصلہ کرنا ہے۔ یہ فیصلہ نہیں کہ اسے کس بڑی طاقت کی آغوش میں گرنا ہے بلکہ یہ فیصلہ کہ بڑی مچھلیوں کی اس لڑائی میں اس چھوٹی سی مچھلی کو اپنے تحفظ، بقا اور ارتقا کے لیے کیا اقدامات کرنے ہیں؟ کیا اسے عالمی صورت حال کے تناظر میں اپنی تمام تر آبادی کو کسی ایک پلیٹ فارم پر متحد کر کے طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہے یا لسانی و نسلی اختلافات کو ہوا دے کر مزید کمزور اور آسان شکار ثابت ہونا ہے۔ ایک قومیت کی تشکیل کا مسئلہ آج جس قدر اہم ہے، اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ اور ایک قومیت کی تشکیل کے لیے موجودہ حالات میں ایک زبان کا قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اس لیے کہ پاکستان کی علاقائی صورت حال کے تناظر میں زبان ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو مختلف تہذیبی پس منظر کے حامل خطوں کے باشندوں کو ایک دوسرے سے جوڑ سکتا ہے۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر ایک دوسرے سے جڑ جانا ہماری مرضی ہو یا نہ ہو، ہماری مجبوری ضرور ہے۔ یہ ہمارے دفاع، اور ہماری بقا کا واحد راستہ ہے۔ بیرونی خطرات میں گھرا ہوا آدمی، اندرونی شکست و ریخت میں الجھ جائے تو گر پڑنا یقینی ہے۔

دراصل اردو کا دوسری پاکستانی زبانوں سے کوئی تنازعہ ہے ہی نہیں اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول قومی زبان کا بنیادی عمل یہی ہے کہ وہ معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان حقارت کی خلیج کو پاٹ کر قومیت کے تصور کو

ابھارتی ہے۔[۲۱] اگر کوئی اختلاف رائے ہے تو پاکستان کے مختلف حصوں کے عوام کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم کرنے میں ناکامی کے بارے میں ہے۔ اگر تمام علاقوں کے عوام کو یکساں سیاسی و معاشرتی حقوق دے دیئے جائیں اور ان کی اقتصادی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ آئے تو شاید زبان اتنا بڑا اختلافی مسئلہ ثابت نہ ہو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی مساعی کا رُخ درست سمت میں موڑ دیا جائے۔ ضمنی مسائل میں الجھنے کی بجائے بنیادی مسائل کے حل کی کوشش کی جائے۔ ہمارا بنیادی مسئلہ لسانی یا گروہی یا صوبائی تعصب نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ ہر خطے، ہر علاقے، ہر صوبے کے رہنے والوں کو تعلیمی اداروں میں، روزگار کے مواقع میں، سماجی مرتبے کے اظہار میں برابر حقوق حاصل ہیں یا نہیں؟ ترقی کے ثمرات ان سب تک پہنچ رہے ہیں یا نہیں؟ بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ کیا جا رہا ہے یا نہیں؟ اور ہم ایک ایسے پاکستان کی تعمیر کی طرف گامزن ہیں یا نہیں جس کا خواب قائد کی آنکھ نے دیکھا تھا۔ سماجی انصاف، مساوات، عدل اور تنظیم کے اصولوں پر مبنی پاکستان۔ ہمیں علاقائی سیاست اور علاقے کے عوام کو ان کی علیحدہ علیحدہ حیثیتوں میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پاکستانی قوم کو رخنے اور روزن پیدا کرنے والی الجھنوں سے نکل کر جوڑنے اور یک جان کرنے والے نظریات کو سامنے لانا ہوگا اور ایک ایسی فضا تشکیل دینی ہوگی جس میں وہ ایک قوم بن کر ابھر سکیں اس لیے کہ اپنے بچاؤ کا یہی واحد راستہ ہے۔

حوالہ جات

1. Montsarrat Guibernau, Nationalisms, The National States and Nationalisms in the Twentieth Century, (United Kingdom: Polity Press, 1996), p.1

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھئے کتابیات۔

۳۔ اسلامی نظریے کے مطابق امت کے معنی ہیں ایسی قوم یا جماعت جو کسی مشترکہ نصب العین کے لیے سرگرم عمل ہو۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کئی مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ سید قاسم محمود، مرتب، شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا، (لاہور: الفیصل ناشران، سن ندارد)، ص ۲۵۸

4. Paul Gilbert, The Philosophy of Nationalism, (USA: Worldview Press, 1998) p. 8-12

۵۔ لطیف احمد شیروانی، مرتب، حرفِ اقبال، (لاہور: ریلوے روڈ، ۱۹۵۵ء)، ص ۲۵۷۔۲۵۹

6. H. Secton-Watson, Nations and States (London: Methuen, 1977) p.3
7. Margaret Canovan, Nationhood and Political Theory, (United Kingdom: Edward Elger, 1996) p. 50
8. Khurshid Ahmad Khan Yusufi, Editor, Speeches, Statements and Messages of the Quaid-i-Azam, Vol IV, (Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1996) P. 2727-2730
9. J.G. Fichet, Addresses to the German Nation (Chicago: Open Court, 1922) p. 215
10. D. Miller, In Defence of Nationality, Journal of Applied Philosophy, 10/1, (1993) p. 6
11. H. Secton-Watson, Nations and States (London: Methuen, 1977) p.5
12. Benedict Anderson, Imagined Communities: Reflection on the Origin and Spread of Nationalism, (London: Verso, 1983) p13-15.
13. Ernest Renan, What is a Nation in Modern Political Doctrin (London: Oxford University Press, 1939) p. 203
14. Ernest Renan, What is a Nation in Modern Political Doctrine? (London: Oxford University Press, 1939) p. 202-3
15. Quoted in Margaret Canovan. Nationhood and Political Theory, (United Kingdom: Edward Elger, 1996) p. 56

۱۶۔ لفظ ''ایتھنک'' کا کوئی ایسا اردو متبادل دست یاب نہیں ہو سکا جو اس کے تمام معانی کو بیک وقت روشن کر سکے اس لیے اسے ایک درآمد شدہ اصطلاح کے طور پر جوں کا توں استعمال کیا گیا ہے۔

17. Ernest Gaellner, Thought and Change (London: Weidenfieldand , p. 168 Nicholson, 1964)

18. Khurshid Ahmad Khan Yusufi, Editor, Speeches, Statements and Messages of the Quaid-i-Azam, Vol IV, (Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1996) P. 2725

۱۹۔ ڈاکٹر سید معین الرحمان، مرتب، مجموعہ مطالعات عبدالحق، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۴۷۴

۲۰۔ پروفیسر فتح محمد ملک، فتنۂ انکارِ پاکستان، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۲۲

۲۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، قومی عظمت قومی زبان سے، مشمولہ، اردو ہے جس کا نام، مرتبہ سید روح الامین (گجرات: عزت اکادمی، ۲۰۰۴ء)، ص ۶۷

کتب برائے مطالعہ

اردو:

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی زبان۔ یک جہتی، نفاذ اور مسائل، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء

روح الامین، سید، مرتب، اردو ہے جس کا نام، گجرات: عزت اکادمی، ۲۰۰۴ء

عبدالواحد معینی، سید، مرتب، مقالاتِ اقبال، لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۸۲ء

فتح محمد ملک، پروفیسر، فتنۂ انکارِ پاکستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

لطیف احمد شیروانی، مرتب، حرفِ اقبال، لاہور: ریلوے روڈ، ۱۹۵۵ء

معین الدین عقیل، ڈاکٹر، مرتب، منتخبات اخبار اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء

معین الرحمان، ڈاکٹر سید، مرتب، مجموعہ مطالعات عبدالحق، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

وحید قریشی، ڈاکٹر، پاکستانی قومیت کی تشکیل نو اور دوسرے مضامین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء

انگریزی:

Benedict Anderson, Imagined Communities: Reflection on the Origin and Spread of Nationalism, London: Verso, 1983

D. Miller, In Defence of Nationality, Journal of Applied Philosophy, 10/1, 1993

Ernest Gaellner, Thought and Change London: Weidenfieldand Nicholson, 1964

Ernest Renan, What is a Nation in Modern Political Doctrine? London: Oxford University Press, 1939

Fichet, J.G. Addresses to the German Nation, Chicago: Open Court, 1922

Khurshid Ahmad Khan Yusufi, Editor, Speeches, Statements and Messages of the Quaid-i-Azam, Vol IV, Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1996

Margaret Canovan, Nationhood and Political Theory, United Kingdom: Edward Elger, 1996

Montsarrat Guibernau, Nationalisms, The National States and Nationalisms in the Twentieth Century, United Kingdom: Polity Press, 1996

Paul Gilbert, The Philosophy of Nationalism, USA: Worldview Press, 1998

Watson. H.Secton Nations and States, London: Methuen,1977